شریف زادہ

ہمارے عنایت فرما مرزا عابد حسین صاحب کے والد ماجد مرزا باقر حسین مرحوم حضرت عباسؓ کی درگاہ کے پاس کہیں رہتے تھے۔ پختہ مکان تھا۔ دس روپیہ ماہوار بلا شرطِ خدمت نواب مکرم الدولہ بہادر کی سرکار سے پاتے تھے۔ اس میں خدا نے یہ برکت دی تھی کہ بافراغت بسر کرتے تھے۔ تین سو روپے کا بی بی کے ہاتھ گلے میں گہنا تھا۔ سو پچاس کا گھر میں اثاثہ تھا۔ دس بیس روپے وقت بے وقت صندوقچے سے نکل بھی آتے تھے۔ عابد حسین کی والدہ نے کبھی آپ چولھا نہیں پھونکا، ماما ہمیشہ نوکر رہی۔ عابد حسین کی کوئی تقریب ایسی نہیں ہوئی جس میں دس بیس عزیز جمع نہ ہوئے ہوں۔ ڈومنیاں نہ آئی ہوں۔ عابد حسین کی شادی اپنے مقدار اور حوصلے کے موافق اچھی طرح کی۔ اگرچہ اس تقریب میں مرزا صاحب مرحوم کسی قدر مقروض ہو گئے تھے مگر جہیز بیچنے کی نوبت نہیں آئی۔ شادی کے برسویں دن ایک لڑکا پیدا ہوا اور اس کی چھٹی بھی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ جب تک ماں باپ زندہ رہے مرزا عابد حسین کو کھانے پینے کی طرف سے فراغت تھی۔ محلہ میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے ان سے فارسی پڑھتے تھے۔ اسکول میں انگریزی پڑھنے جاتے تھے۔

جب مرزا باقر حسین نے انتقال کیا۔ عابد حسین مڈل کلاس تک پہنچ گئے تھے۔ اگرچہ والد کے مرنے کا صدمہ بہت سخت ہوا مگر جوں توں کر کے مڈل پاس ہو گئے۔

والد کے مرنے کے بعد گھر کے انتظام کا کُل بار ان کے سر پر پڑا۔ مگر اخراجات سے کسی قدر اطمینان تھا اس لیے کہ نواب کی سرکار سے سات روپیہ ماہوار ان کی والدہ کو ملتا رہا مگر ان کی بدقسمتی سے پورا سال نہ گزرنے پایا تھا کہ نواب کربلائے معلیٰ چلے گئے اور وہاں جا کے دو ہی مہینے کے بعد انتقال فرمایا۔

اب یہ انٹرنس کلاس میں تھے جب باہر کی آمدنی بالکل موقوف ہو گئی تو اخراجاتِ روز مرّہ کے لیے گھر کا اثاثہ بکنے لگا۔ یہاں تک کہ سونے چاندی کا اسباب بک گیا۔ تانبے کے برتنوں کی نوبت آئی وہ بھی ایک ایک کر کے بک گئے۔ یہاں تک کہ سوائے دو تین پتیلیوں اور دو لوٹوں کے کچھ باقی نہ رہا۔

یہ اب تک اسکول میں پڑھنے جاتے تھے اور تمام امیدیں امتحان کے پاس ہونے پر منحصر تھیں۔ یہاں تک کہ امتحان کا زمانہ قریب آیا۔ ہیڈ ماسٹر نے فیس طلب کی۔ بیوی کی چوڑیاں گروی رکھ کے دس روپے فیس کے جمع کیے۔ امتحان کے دو دن باقی تھے کہ والدہ ہیضے میں مبتلا ہوئیں اور ٹھیک اسی دن انتقال کیا کہ جس دن انھیں امتحان میں شریک ہونا چاہیے تھا۔ اس حادثۂ ناگہانی کی وجہ سے بیچارے امتحان سے محروم رہے۔ ساری محنت کی کرائی خاک میں مل گئی۔

ماں کا مرنا تھا گویا ان کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ خانہ داری کا پورا

پورا بوجھ دفعتہ آن پڑا۔ گھر کا اسباب اور بیوی کا جہیز ماں کے جیتے جی بک کر صَرف ہو چکا تھا اور جو کچھ رہا سہا تھا وہ اُن کی تجہیز و تکفین اور رسوم فاتحہ وغیرہ میں صَرف ہو گیا۔ اب گھر میں ایک حبہ نہیں ہے جسے گروی رکھیں یا بیچ لیں۔ گھر میں ایک خود ہیں، ایک بی بی، ایک لڑکا کوئی تین برس کا، ایک لڑکی چھ مہینے کی گود میں، ابھی تک صورتِ روزگار نہیں اور نہ کہیں سے امید ہے مگر استقلال یہ ہے کہ ابھی تک پڑھے جاتے ہیں۔ امتحان کے چھ مہینے اور باقی ہیں کسی طرح ہو اب کی ضرور پاس ہونا چاہیے۔ آخر کچھ نہ بن پڑا۔ ایک فتو کنجڑا رہتا تھا۔ مکان اس کے پاس سو روپے پر گروی رکھا رہن باقبضہ تھا۔ خود محمود نگر کے نالے پر ایک کچا سا مکان ایک روپیہ ماہوار کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔ خیر امتحان کے زمانے تک کے لیے اطمینان ہو گیا۔ جی توڑ کے محنت کی۔ خدا خدا کر کے پاس بھی ہو گئے۔ اب نوکری کی تلاش ہے۔

آج بہت ہی پریشان گھر سے نکلے ہیں۔ منھ اترا ہوا ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ مارے ضعف کے قدم نہیں اٹھتا۔ (دل میں کہے جاتے ہیں)

افسوس! آج ہمارے بیوی بچوں کا دوسرا فاقہ ہے۔ راستے میں جو لوگ ملتے ہیں، ان کے چہرے کس قدر بشاش نظر آتے ہیں۔ کنجڑوں کی دکانیں میووں اور ترکاریوں سے بھری ہوئی ہیں۔ نان بائی گرم گرم شیرمالیں اور خمیری روٹیاں تنور سے نکال رہے ہیں۔ نہاری کے پتیلے سے گرم گرم بھاپ نکل رہی ہے۔ فجو کی دوکان پر حلوہ سوہن بھی تازہ تازہ بنا ہوا ہے۔ تمام راستہ مہکا ہوا ہے۔ حلوائیوں کی دکانوں پر پوریاں، کچوریاں، حلوے، مٹھائیاں کیسی پٹی پڑی ہوئی ہیں۔ اس میں سے کچھ بھی ہمارا اور ہمارے غریب بیوی بچوں

کا حصہ نہیں۔ صرّاف کی دو دکانوں پر پیسوں کا ڈھیر ہے۔ لوگ کیسے چھنا چھن روپے بھناتے ہیں۔ ہم کو ایک پیسہ تک نہیں میسر کہ اپنے بچوں کے لیے چنے بھنا کے لے جائیں۔

انٹرنس کا سارٹیفکٹ جیب میں ہے۔ اگر تھوڑا سا شیرہ ممکن ہوتا تو بلا سے اسی کو چاٹتے یا بیوی بچوں کو چٹاتے۔ افسوس میں نے بڑی غلطی کی۔ جیسے ہی مڈل پاس ہوا تھا رڑکی کالج میں چلا جاتا۔ دو سال کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتے۔ دیکھو رام چرن میرے ہی ساتھ مڈل میں پاس ہوا تھا۔ اب سنا ہے کہ رائے بریلی میں اسے سب اوورسیری مل گئی ہے۔ کاش میڈیکل کالج ہی چلا جاتا۔ ہیڈ ماسٹر نے اس زمانے میں کیسا کیسا کہا۔ افسوس میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑی ماری۔ تین برس مفت ضائع ہوئے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں لڑکھڑاتے ٹھوکریں کھاتے گول دروازے تک پہنچ گئے۔ اب قریب دس بجے کا وقت تھا۔ جو لوگ دفتروں میں نوکر تھے۔ اِکّوں پر سوار ہو ہو کے دفتر جا رہے تھے۔ دو ایک اِکّے والوں نے انھیں بھی ٹوکا۔

"منشی صاحب ادھر آئیے۔ حضرت گنج چلیے گا؟" یہ بیچارے حضرت گنج ہی کی طرف جانے والے تھے مگر پیسہ کہاں تھا جو سوار ہو کے جاتے۔ چپکے ہو رہے۔ سڑک کے کنارے پاپیادہ روانہ ہوئے۔

میاں تو نوکری کی تلاش میں گئے۔ اب بیوی کا حال سنیے۔ یہ بیچاری صبح سے اٹھ کے ٹوپی کاڑھنے میں مصروف تھیں۔ ایک پلہ تو کئی دن سے تیار تھا۔ دوسرے میں کچھ کام باقی تھا۔ بارے اس وقت دونوں پلے تیار ہوئے۔ اب اس کے فروخت کرنے کی فکر ہوئی۔ مکان میں ایک کھڑکی تھی

وہاں جاکے پکاریں۔ "ہمسائی!" ہمسائی کھڑکی کے پاس آئیں۔

عابد حسین کی بیوی۔ ہمسائی تمہارے میاں گھر میں ہیں؟

ہمسائی۔ ہاں۔ کیا ٹوپی تیار ہو گئی؟

عابد حسین کی بیوی۔ ہاں بہن۔ خدا خدا کر کے آج تیار ہوئی۔ ذرا اپنے میاں کو دکھا دو۔ ہمسائی ٹوپی میاں کے پاس لے گئیں۔

میاں۔ ہاں۔ یہ ٹوپی خوب تیار ہوئی۔

ہمسائی۔ بھلا کتنے کی ہوگی؟

میاں۔ بازار میں دکھانے سے حال معلوم ہوگا۔ میرے اندازے میں تو کوئی دس گیارہ آنے کی ہوگی۔

بیوی۔ اچھا تو بیچ لا دو۔ بیچاری کے یہاں آج تیسرا فاقہ ہے۔ بچے غش کی حالت میں پڑے ہیں۔

میاں۔ تیسرا فاقہ! تم نے مجھ سے نہ کہا بنیے کے یہاں سے کچھ لا دیتا۔

بیوی۔ چپ رہو۔ کھڑکی کے پاس کھڑی ہیں۔ کہیں سن نہ لیں۔ بڑے غیرت دار لوگ ہیں۔ چاہے دم نکل جائے منہ سے نہ کہیں گے۔ قرض دام بھی نہیں لیتے۔ بیوی میاں دونوں کی ایک راہ ہے۔ جب فاقہ ہوتا ہے بچوں تک کو گھر سے نکلنے نہیں دیتے۔

میاں۔ بڑے عالی خاندان ہیں۔ خدا نے اب مصیبت ڈالی ہے۔ ان کے باپ کے کارخانے ہی اور تھے۔ اچھا تو لاؤ میں جلدی سے ٹوپی بیچ لاؤں۔

یہ کہہ کے میاں حسین علی نے الگنی پر سے انگرکھا اتار کے پہنا۔ ٹوپی پہنی۔ وہ ٹوپی جیب میں رکھی۔ گھر سے نکلے۔ جلدی جلدی پارچے والی گلی پہنچے۔ دو ایک دوکان داروں کو وہ دونوں پلے دکھائے۔ کسی نے گیارہ آنے لگائے۔

کسی نے بارہ آنے لگائے۔ ایک صاحب شوقین ایک دکان پر ٹوپیاں دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے یونہی سرسری نگاہ سے دونوں پلے دیکھ کے آنکھ سے اشارہ کیا۔ یہ دوکاندار سے ٹوپی لے کے تھوڑی دور آگے جا کے کھڑے ہو رہے۔ تھوڑی دیر میں وہ آ گئے۔

خریدار۔ اچھا تو کتنے کو دیجیے گا؟

حسین علی۔ حضرت میرا تو مال نہیں ہے۔ جس کا مال ہے اس نے کہہ دیا ہے کہ ایک روپے سے کم نہ دینا۔ اب آپ کو اختیار ہے لیجیے یا نہ لیجیے۔

خریدار۔ دوکاندار بارہ آنے لگاتا ہے، آپ ایک روپیہ مانگتے ہیں۔ اتنا فرق؟

حسین علی۔ دکاندار تو چاہتے ہیں کملی ڈال کے لوٹ لیں۔ جب بیچنے والا بھی دے۔

خریدار۔ اچھا جو وہ آنے لے لو۔

حسین علی۔ روپئے سے ہرگز کم نہ ہوگی۔

خریدار۔ (پھر ایک مرتبہ ٹوپی کے دونوں پلوں کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا) اچھا۔ خیر ایک ہی روپیہ لے لو۔ تمہاری ہی ضد سہی۔

حسین علی۔ درست ہے۔ اے حضور مال نہیں ہے؟

خریدار۔ اس میں شک نہیں، بنی اچھی ہے اور اس کے ساتھ کی مل سکتی ہے؟

حسین علی۔ جی اور کہاں۔ میرے پاس ایک ہی کاریگر ہے۔ اس کام کی دس بارہ دن میں ایک ٹوپی تیار ہوتی ہے۔

خریدار۔ اچھا تو اب کی ٹوپی جو بنے تو ہم ہی کو دینا۔ تمہارا مکان کہاں ہے؟

حسین علی۔ آپ اپنا دولت خانہ بتا دیجیے جس دن ٹوپی تیار ہو جائے گی لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔

خریدار۔ یہ کیا جھوائی ٹولہ میں حکیم صاحب کے مکان کے قریب نواب محمد عباس

صاحب کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں، ان ہی سے پوچھ لینا، میر صاحب کہاں رہتے ہیں بلکہ میں وہیں ملوں گا۔ اے لو یہ روپیہ تو لو۔ باتوں میں دینا ہی بھول گیا۔
حسین علی۔ کیا ہرج ہے پھر مل جاتا۔

خریدار تو روپیہ دے کر اُدھر روانہ ہوا۔ ادھر میاں حسین علی خوش خوش قدم بڑھاتے ہوئے گھر کی طرف چلے۔

آہا! کیا ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں جو دوسروں کا کام کر کے خوش ہوتے ہیں؟ ہاں ہیں۔ اور ایسے لوگوں میں ہیں جن کو مغرور بندۂ زر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جن کا چال چلن بہت ہی سیدھا سادہ ہے۔ اس لیے لوگ انہیں بے وقوف سمجھتے ہیں۔ انھوں نے وہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہیں پائی جو خود غرضی کے اصول سکھاتی ہے۔ اسی لیے انھیں سادہ لوح کا خطاب دیا جاتا ہے۔ انھوں نے وہ علمِ مجلس نہیں حاصل کیا جس میں ظاہر داری اور بناوٹ انسانیت کے اصلی جذبات کو چھپا دیتی ہے۔ اس لیے بیچارے بے تمیز خیال کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے وہ لغو فلسفہ نہیں پڑھا جو مذہب کے مقدس اصول میں شک ڈال دیتا ہے۔ اس لیے جاہل کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ گورنمنٹ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے نہ اس میں نکتہ چینی کرتے ہیں اس لیے انھیں اعلیٰ درجہ کی یا تمدنی عزت کے حاصل کرنے کا خیال ہی نہیں۔ قومی اصلاح کی انھیں فکر نہیں رہتی۔ اس لیے کہ اصل محک یعنی شہرت کی ہوس انھیں ہوتی ہی نہیں۔

جب حسین علی روپیہ لے کے آئے تو انھوں نے اپنی بیوی کو دیا۔ بیوی خوشی خوشی دوڑی گئیں۔ مرزا عابد حسین کی بیوی کو کھڑکی کے پاس بلایا۔ روپیہ حوالہ کیا۔ اس وقت کی خوشی اس نیک بخت اور غریب بی بی کی زبانِ قلم سے

ادا نہیں ہو سکتی۔ اس روپیہ کی قدر اسی کو ہو سکتی ہے جس کے بچوں نے دو دن سے کچھ نہ کھایا ہو۔ جس کا شوہر روز صبح کو بھوکا پیاسہ نوکری کی تلاش میں نکل جاتا ہو اور شام کو مایوس گھر میں آکر چپکا سو رہے۔ بیوی نے فوراً میاں حسین علی سے روپیہ بھنایا۔ بنیے کی دوکان سے کھانے کے لیے اناج منگایا۔ بچوں کو جلدی سے دو ٹکیاں ڈال کے کھلائیں۔ پانی پلا کے سلا رکھا۔ خود کچھ نہیں کھایا۔ ایک ٹوپی کا کپڑا اور رکھا تھا۔ اسے بقچی سے نکالا۔ چھاپے نکالے۔ گیرو کی سیاہی میں تھوڑا سا پانی ڈال کے ٹوپی چھاپی۔ کاڑھنا شروع کر دی۔ مارے بھوک کے آنکھ سے ٹانکا نہیں سوجھتا۔ پھول سے گال مرجھائے جاتے ہیں۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ مگر کیا ممکن کہ بے میاں کے کچھ کھالیں۔ دل قوی ہے۔ چار دن کے کھانے کو سامان گھر میں موجود ہے۔ شام کو میاں آئیں گے۔ خدا کرے آج کہیں نوکری ہو جائے۔ کیا ہی اچھی بات ہے۔ اسی خیال کے ساتھ ہی ایک آہِ سرد دل سے نکلی اور اس کے ساتھ دو آنسو ڈھلک کے گالوں تک آگئے۔ ہاتھ رک گیا۔ دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے۔ پھر چھاپ سوئیاں نکلنے لگیں۔

اب چار بجے ہوں گے۔ کھانا پکانے کا وقت ہے۔ انھیں یہ خیال ہے کہ یہ پھول اور تمام کر لوں تو اٹھوں۔ پھول بن گیا۔ ٹوپی کو ہاتھ میں لے کے پنکھے کو دونوں ہاتھوں سے پھیلا کے شکن مٹائی۔ جے پھول بن گئے تھے ان کو غور سے دیکھا۔ پھر سوئی لگا کے ٹوپی بقچی میں باندھ دی۔ اٹھیں۔ وضو کیا۔ ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر کوٹھری سے تول کے آٹا دال نکال لائیں۔ نمک مصالحہ علیحدہ علیحدہ کر کے رکھا۔ چولھے میں آگ سلگائی۔ دال دھو کے چڑھائی۔ آٹا گوندھنے بیٹھ گئیں۔ ادھر عابد حسین سرِ شام گھر کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ دن

بھر میں کئی دفتر چھان مارے۔ دس بارہ بنگلوں پر گئے مگر جہاں گئے ادعرضی دی، یہی صدا سنائی دی۔ کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ ایک صاحب نے یہ رائے دی۔ صدر بازار جاؤ۔ شاید گوروں کو اردو پڑھانے کے لیے نوکر ہو جاؤ۔ صدر گئے۔ بارکوں میں مارے مارے پھرے۔ دو ایک گوروں نے بلایا بھی۔ مگر نہ اُن کی یہ سمجھے نہ وہ ان کی سمجھے۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے انگریزی اول تو پڑھی ہی کیا تھی۔ دوسرے جو کچھ پڑھی تھی وہ ہندوستانی ماسٹروں سے پڑھی تھی۔ انٹرنس کلاس میں جو صاحب انگریزی پڑھاتے تھے اُن کا تلفظ بہت صاف تھا۔ وہ بھی مشکل سے سمجھتے تھے۔ گوروں کا لہجہ بھلا ان کی سمجھ میں کیا آتا۔ خلاصہ یہ کہ جہاں گئے وہاں سے ڈیم فول بنا کے نکالے گئے۔ اس آوارہ گردی میں شام ہو گئی۔ اب ضعف کے مارے چلا نہیں جاتا۔ ہر قدم پر چکر آتے ہیں۔ مگر مجبوری گھر تو کسی نہ کسی طرح پہنچنا ہی ہے۔ گھر میں بیوی بچوں کو جس حالت میں چھوڑ آئے تھے اس کی تصویر تو دن بھر پیشِ نظر رہی مگر امید بڑی چیز ہوتی ہے۔ جس نے دن بھر بہلائے رکھا۔ خوب دوڑایا۔ جب اچھی طرح تھکا چکی تو چھوڑ دیا۔ اب اسی پرانے رفیق سے کام پڑا جسے یاس کہتے ہیں۔ اس سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ موت کے تصور کو سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ آخر ہونا ہی کیا ہے؟ اگر یہی حال ہے تو مر بھی جائیں گے۔ ہائے اپنا مر جانا تو کچھ ایسا دشوار نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دینا کس سے دیکھا جائے گا۔ اُف! مفلسی کیا بری بلا ہے۔ اس سے اب نجات ہو ممکن نہیں۔ کاش بیوی بچے نہ ہوتے۔ میرے ساتھ ان بدبختوں کی بھی مٹی خراب ہوئی۔ کچھ بن نہیں پڑتا۔ کروں تو کیا کروں۔ اسی خیال میں تھے کہ ایک چکر آیا۔ اس نے سڑک کے کنارے ایک جگہ گھاس پر بٹھا دیا۔ اب اٹھتے

ہیں تو اٹھا نہیں جاتا۔ ساتھ ہی یہ خیال آیا۔ گھر جا کے کیا کریں گے۔ یہاں سے سیدھے موتی محل کے پل کی منڈیر سے اپنے کو دریا میں گرا دو۔ ڈوب مرو۔ :: میدی کی رائے پسند آئی تھی کہ اس کے ساتھ ہی بیوی بچوں کی بے کسی کا خیال آیا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ خیر کچھ نہ سہی۔ میرے دم سے بیچاروں کو کسی قدر سہارا تو ہے۔ کسی کی آس توڑنا اچھا نہیں ہے۔ یہ کیا بودا پن ہے۔ اب عالی خاندانی اور بے جا شرم کو ترک کرنا چاہیے۔ نوکری اس زمانے میں ملے۔ ممکن نہیں۔ کل سے ٹوکری لے کے چوک میں جانا چاہیے۔ کیا کہیں مزدوری بھی نہیں ملے گی۔ محنت مزدوری میں کوئی عیب نہیں۔ شام تک دو آنے تو ملیں گے۔ بچے فاقے سے تو نہ پڑے رہیں گے۔ اچھا اگر یہ بھی نہ ہو سکے مکان جو گروی ہے اسے بیچ ڈالنا چاہیے۔ دس بیس جو بڑھیں اس سے نخاس میں کاٹ کباڑ کی دکان کھولیں۔ شاید اسی سے کام چلے۔

یہ ان ہی خیالات میں تھے۔ اتنے میں ایک گنوار سا آدمی سر میں پھینٹا بندھا ہوا مرزئی پہنے، دھوتی باندھے ان ہی کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ یہ اٹھنے ہی کو تھے کہ اس شخص نے پوچھا "میاں صاحب آپ کچھ پھارسی (فارسی) پڑھے ہیں؟"

عابد حسین۔ ہاں پڑھا تو ہوں۔ کیوں؟

وہ شخص۔ مجھے ایک خط پڑھوانا ہے۔

عابد حسین۔ پڑھ تو دیتا مگر یہاں روشنی کہاں ہے؟

وہ شخص۔ سامنے لالٹین کے پاس چل کے پڑھ دیجیے۔

عابد۔ چلو۔ یہ کہہ کے لالٹین کے پاس آئے۔ اس نے مرزئی کی جیب سے

خط نکال کے دیا۔ خط کاہے کو ایک طومار کا طومار تھا۔

خط کا خلاصہ یہ تھا کہ بلدیو مستری کی معرفت ایک ہزار روپئے کا لوہا خرید کر بھیج دو۔ مبلغ دو سو روپے نقد اس خط کے ساتھ روانہ کیا جاتا ہے۔ وہ دے دینا۔ باقی روپیہ بروقت پہونچنے لوہے کے بھیج دیا جائے گا اس کے بعد لوہے کی فہرست تھی جسے اٹک اٹک کر پڑھتے جاتے تھے اور وہ بتاتا جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ خط تمام ہوا۔ اب وہ شخص کہنے لگا۔ اچھا تو اب اس کا جواب میں کس سے لکھواؤں گا۔ آپ ہی لکھ دیجیے۔ بڑا ضروری خط ہے۔ منت سماجت کرنے لگا۔

وہ شخص۔ تھوڑی دور چلے چلیے۔ بلدیو مستری کا کارخانہ ہے۔

عابد۔ میرا مکان یہاں سے بہت دور ہے۔ مجھے بہت رات ہو جائے گی۔ تم کسی اور سے لکھوا لینا۔

وہ شخص۔ دیر نہیں ہونے پائے گی اور اگر دیر ہو جائے گی تو گھر کا اکہ ہے۔ میں آپ کو سواری پر بھجوا دوں گا۔

عابد۔ (دل میں) ہرج ہی کیا ہے۔ چلو اچھا ہوا۔ چلا بھی نہیں جاتا ہے۔ اکہ پر سوار ہو کر جلدی سے گھر پہنچ جائیں گے۔

اچھا تو چلو۔

اس شخص کے ساتھ بلدیو مستری کے کارخانے میں پہنچے۔ دیکھا ایک بڑا سا احاطہ ہے۔ اس میں چاروں طرف کھپریلیں پڑی ہیں۔ صحن میں جدھر دیکھو لوہے کا ڈھیر ہے۔ ایک طرف پتھر کے کوئلوں کا انبار لگا ہے۔ کھپریلوں میں جا بجا لوہے کی بھٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ دھونکنی چل رہی ہے۔ لوہا سرخ کر کر کے ان سے نکالا جاتا ہے۔ ہتھوڑے چل رہے ہیں۔

ایک کھپریل میں ایک چارپائی بچھی ہے۔ اس کے پاس دو تین چیڑ کے صندوق پڑے ہیں۔ ان میں سے ایک پر ایک بوڑھا سا آدمی لیکن بہت ہی توانا ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ قرینے سے معلوم ہوا کہ بلدیو مستری یہی ہے۔ جو شخص ان کو لے گیا تھا اس نے ایک صندوق پر ان کو بٹھا دیا۔ چراغ دان لاکے ان کے آگے رکھ دیا۔ ان سے کہا کہ ذرا مستری جی کو یہ خط پھر سنا دیجیے۔ انھوں نے خط پڑھ کے سنایا۔ اب جواب لکھنے کے لیے قلم دوات کی ضرورت ہوئی۔ بلدیو نے کہا۔ بھیا سے مانگ لو۔ اس شخص نے مادھو بھیا کہہ کے پکارا۔ بھیا مادھو، بلدیو کا لڑکا۔ کوئی چودہ پندرہ برس کا سن سامنے کھپریل میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے چھوٹی سی میز لگی تھی۔ اس پر کتابیں رکھی تھیں۔ لیمپ روشن تھا۔ اس شخص کی آواز سن کے جواب دیا۔ کا کا کیا ہے؟

وہ شخص۔ اپنی قلم دوات تنی لے آؤ۔ تھوڑا کاگد بھی لیتے آیو۔

بھیا مادھو قلم دوات کاغذ لے کے آئے۔ مرزا عابد حسین جواب لکھنے لگے۔ وہ بھی پاس بیٹھ گیا۔

جواب لکھنے میں بڑی دیر ہوئی۔ اس لیے کہ ہر قسم کے لوہے کا وزن اور قیمت مع نرخ کے لکھوایا جاتا تھا۔ مرزا صاحب کے حواس بجا نہ تھے۔ بھیا سے حساب کرنے میں ان کو مدد ملی۔ اس درمیان میں اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی جاتی تھیں کیوں کہ ان لوگوں کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بیچارے کس آفت میں مبتلا ہیں۔ نہیں تو شاید جلدی کرتے۔ یہ ایک نئے آدمی شہر کے رہنے والے وہاں جا کے پھنسے تھے۔ معمولی باتیں یہ کہ آپ کا مکان کہاں ہے؟ اس طرف کیوں آئے تھے؟ ان سے پوچھنا ضرور تھیں۔ سب سے

زیادہ مادھو بھیا کو ان کے حال پر توجہ تھی کیونکہ مادھو بھیا انگریزی پڑھتے تھے اور ان کے طرز تقریر سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بھی انگریزی جانتے ہیں۔ شاید اثنائے کلام میں یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ آپ نے کہاں تک انگریزی پڑھی ہے اور آپ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا ہو کہ میں انٹرنس پاس ہوں۔ مادھو بھیا ابھی مڈل کلاس کے دو درجے نیچے تھے۔ پھر ان کا فارسی خط بھی بہت ہی صاف تھا اور مادھو بھیا آج ہی بدخطی کے لیے کلاس میں دو نمبر اتار دیے گئے تھے۔ ان وجوہ سے مادھو بھیا کے دل میں ان کی عزت کا خیال سما گیا تھا۔

انٹرنس پاس کا نام سن کے بلدیو مستری بھی چونک پڑے تھے۔ اس لیے کہ جب سے مادھو کو اسکول میں پڑھنے بھیجا تھا۔ مڈل اور انٹرنس یہ دونوں لفظیں اتنی مرتبہ سنی تھیں کہ اب ان کا بھولنا ممکن نہ تھا۔ بہت دن تک یہ مڈل اسکول کو اعلیٰ درجہ سمجھا کیے۔ لیکن جب سے ریل کے دفتر میں پرشادی بابو دس روپے مہینے پر نوکر ہوئے مڈل پاس کی عزت ان کی نگاہ میں کم ہو گئی مگر کہیں سن لیا تھا کہ بڑے بابو جو لوگ آفس میں نوکر ہیں۔ وہ انٹرنس پاس ہیں۔ ماسٹر جانکی پرشاد جو مادھو کو گھر پر انگریزی پڑھاتے تھے وہ وکیل ہو گئے۔ اب لیجیے وہ بھی کیا برے رہے۔ گنپت بڑھئی کا لڑکا چھوٹے لال انٹرنس پاس کر کے رڑکی چلا گیا تھا۔ وہ اب اوورسیر ہے۔ غرضکہ ان خیالات سے انٹرنس کی عزت ان کے دل میں بہت کچھ تھی۔ ساری امیدیں مادھو کے انٹرنس پاس کرنے پر موقوف تھیں۔ انٹرنس کے درجہ سے ان کو اس قدر حسن ظن تھا کہ مرزا عابد حسین کی پریشان حالی ان کے چشم سے نظر ہی نہ آ سکتی تھی۔ جب سے ان کو دیکھا تھا اور یہ سنا تھا کہ یہ انٹرنس پاس ہیں،

دل میں کہتے تھے۔ پر مشردہ دن کرے کہ مادھو بھیا بھی انٹرنس پاس کرلیں۔ مگر ابھی وہ دن دور ہے۔ چار پانچ برس باقی ہیں۔ اب کوئی گھر پر پڑھانے والا بھی نہیں۔ دل میں ایسے ہی کچھ خیالات تھے کہ ایک ہی مرتبہ مرزا عابد حسین سے پوچھا۔

بلدیو ۔ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے ؟

عابد حسین ۔ چوک کے پاس۔

بلدیو ۔ اوہو۔ آپ بہت دور رہتے ہیں۔

عابد حسین ۔ (اس سوال کے رخ سے کچھ اپنے مطلب کی فال لیا چاہتے تھے) کیوں ؟

بلدیو ۔ کچھ نہیں۔ اگر کہیں پاس مکان ہوتا تو مادھو بھیا گھنٹہ دو گھنٹہ آپ سے پڑھ لیا کرتے۔

عابد حسین ۔ پھر دور مکان ہے تو کیا ہے۔ میں تو اس طرف آیا ہی کرتا ہوں۔

بلدیو ۔ کیوں ؟

عابد حسین ۔ یونہی نوکری کی تلاش میں۔

بلدیو ۔ اچھا تو آپ مادھو کو پڑھا دیا کریں گے ؟

عابد حسین ۔ بڑی خوشی سے۔

بلدیو ۔ میں جو ماسٹر جانکی پرشاد کو دیتا تھا۔ آپ کو بھی دوں گا۔

عابد حسین ۔ ان کو کیا دیتے تھے ؟

بلدیو ۔ پانچ روپیہ مہینہ۔

عابد حسین ۔ بہتر ہے۔ میں پڑھا دیا کروں گا۔

مادھو ۔ تو پھر کب سے آئیے گا ؟

عابد حسین ۔ جب سے کہو۔
مادھو ۔ آٹھ دن ہمارے امتحان کو رہ گئے ہیں۔ اگر کل ہی سے آئیے تو اور اچھا ہو۔
عابد حسین ۔ کل ہی سے آؤں گا۔ کس وقت آیا کروں ؟
مادھو ۔ صبح کو آئیے یا شام کو۔ یہی دو وقت ہیں۔
عابد حسین ۔ اچھا تو میں صبح کو سات بجے پہنچ جایا کروں گا

خط تمام ہو چکا تھا۔ باتوں میں یہ مطلب بھی نکل آیا۔ اب وہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جو شخص ان کو ساتھ لایا تھا اس نے بلدیو سے اکہ کے لیے کہا۔ معلوم ہوا ہے کہ اکہ والا کہیں سواری لے کر گیا ہے۔ اس لیے اس نے ایک چونی نکال کے مرزا عابد حسین کے ہاتھ پر دھری۔ پہلے تو انھوں نے انکار کیا اس خیال سے کہ بلدیو کی نگاہ میں ذلیل نہ ہو جاؤں۔ مگر بلدیو نے خود کہا۔ میاں صاحب لے لیجیے حسین گنج سے اکہ کر لیجیے گا۔ رات زیادہ ہو گئی ہے اور پھر آپ سویرے آنے کو بھی کہتے ہیں۔ جلدی سے گھر پہنچ جائیے گا۔ مرزا عابد حسین نے چونی لے کے جیب میں رکھی اور کارخانے سے روانہ ہوئے۔

عابد حسین کی حالت سخت مایوسی کی تھی۔ اتنا سہارا جو ملا جان میں جان آئی۔ اب گھر کی طرف جلد سے جلد قدم اٹھنے لگے۔ راستے میں اِکے بہت سے ملے مگر گھر میں بیوی بچوں کو اس حالت میں چھوڑ کے آئے تھے خیال کیا کہ اب اگر اکہ کرتا ہوں تو کم سے کم دو آنے فضول خرچ ہو جائیں گے۔ چار آنے میں دو وقت روٹی چل سکتی ہے۔ تھوڑا جبر اور گوارا کرو۔ پا پیادہ پہنچ ہی جاؤ گے۔ بارے جس طرح ہو سکا گھر پہنچے۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ دروازے پر آکر کنڈی کھڑکھڑائی۔ بیوی نے اٹھ کے دروازہ کھولا۔ دیکھا گھر میں چراغ جل رہا ہے۔ حیرت ہوئی کہ تیل

کہاں سے آیا اور یہ حیرت اور بھی زیادہ ہوئی جب بیوی نے ان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی دسترخوان لاکے بچھایا۔ کھانا نکال کے آگے رکھا۔ انھیں ہاتھ دھونے کو پانی دیا۔ خود ہاتھ دھویا۔ کھانے کو آکے بیٹھ لیں۔

عابد ۔ ہائیں یہ سب کہاں سے آیا۔؟

بیوی ۔ وہی ٹوپی آج بکی نا۔

عابد ۔ کمال کیا۔ ٹوپی تیار کرلی اور بکوا بھی لی۔

بیوی ۔ تو پھر کیا کرتی۔؟

عابد ۔ بڑا کام کیا۔ بچے کھا چکے؟

بیوی ۔ بچوں کو ماشاءاللہ دوسرا پھیرا ہے۔ ابھی تو کھا پی کے سوئے ہیں۔

عابد ۔ اور تم نے کچھ نہیں کھایا؟

بیوی ۔ اب تمہیں میری کیا فکر پڑ گئی۔ لو کھاؤ۔

عابد ۔ واہ کیا میں جانتا نہیں تم یونہی بیٹھی ہوگی۔ کیا بری عادت ہے۔

بیوی ۔ اور تمہیں یہ دیر آج کہاں لگی؟ روز تو سویرے آجایا کرتے تھے۔؟

عابد حسین نے اپنا تمام واقعہ سرے سے آخر تک مفصل سنایا۔ بیوی سن کے باغ باغ ہوگئیں۔ مرزا عابد حسین کی بیوی ان بیویوں میں نہ تھیں جو خواہ مخواہ اپنے شوہروں کی شکایت کیا کرتی ہیں۔ اس موقع پر انھوں نے میاں کی جو دلجوئی اور تسکین کی وہ قابل ہزار آفریں ہے۔

بیوی ۔ خدا نے میرے بچوں پر رحم کیا۔

عابد ۔ ہاں سہارا تو ہوگیا ہے مگر پانچ روپے میں کیا ہوگا؟

بیوی ۔ خدا کا شکر کرو نمک کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ پانچ روپے بہت ہوتے ہیں خدا نے چاہا تو اب فاقہ نہ ہوگا۔ میری ٹوپی بھی اب روپے کو جانے لگی ہے۔

مہینہ میں چار ٹوپی اگر تیار ہوں گی تو چار روپے کہیں نہیں گئے ہیں۔ تم اپنا دل مضبوط رکھو۔

عابد:۔ میرا دل مضبوط ہے۔

دونوں میاں بیوی نے کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کیا۔ نمازیں پڑھیں۔ سو رہے

دوسرے دن صبح کو سات بجتے بجتے مرزا عابد حسین بلدیو مستری کے کارخانے میں پہنچ گئے تھے۔ مادھو بہت ہی شوقین لڑکا تھا۔ وہ صبح چھ بجے ہی سے کتابیں کھول کر پڑھنے بیٹھ گیا تھا۔ عابد حسین نے پہلے انگریزی کتاب کا سبق پڑھایا۔ ہر ایک مشکل لفظ کے ہجے اور معنی پوچھے۔ پھر املا لکھوایا۔ اس میں صرف ایک غلطی نکلی۔ اسے درست کر دیا۔ اس کے بعد گرامر (صرف ونحو) کا سبق ہوا۔ اب اردو کی باری آئی۔ مادھو اردو میں بہت ہی کمزور تھا۔ حرفوں کا تلفظ صحیح نہیں بتایا گیا تھا۔ شین قاف تک درست نہ تھا۔ اس میں عابد حسین کو بڑی محنت کرنا پڑی۔ پھر حساب شروع ہوئے۔ کل درجے میں جو سوالات مادھو کو دیے گئے تھے وہ اس نے رات ہی کو لگا رکھے تھے۔ عابد حسین نے قاعدۂ عمل بڑے غور سے جانچ کے جہاں جہاں خامی تھی اسے درست کر دیا۔ مادھو کے انگریزی اور فارسی دونوں خط ٹھیک نہ تھے اور نہ اسے اس طرف زیادہ توجہ تھی مگر عابد حسین نے دو کاپیاں اسی دن بنوائیں اور اپنے سامنے لکھوانا شروع کیا۔ جو لوگ اس سے پہلے مادھو کو پڑھاتے تھے۔ وہ بہت سا وقت باتیں کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ مادھو کو اس کی عادت پڑی ہوئی تھی مگر عابد حسین باتیں کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ابتدائے عمر سے انھیں محنت کی عادت تھی۔ ماں باپ نے ایسی صحبتوں میں بیٹھنے ہی نہ دیا جس سے مذاق کا مفہوم ان کے ذہن میں سما جاتا، جس سے ان کو یہ معلوم ہوتا کہ فضول گپیں اڑانا

بھی حفظانِ صحت کے اصول میں داخل ہے۔ لکھنؤ کے اکثر صاحبزادوں کو عنفوانِ شباب سے عشق بازی کا چسکا پڑ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی شعر و سخن کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔ اس بہانے سے اکثر ناجائز تخیلات کو عمدہ الفاظ کے پیرائے میں ادا کرنے کا اچھا موقع مل جاتا ہے۔ ان بلاؤں سے خدا نے ان کو محفوظ رکھا تھا۔ ابھی پورے جوان بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان کے والد مرحوم نے ازراہِ دوراندیشی ان کی شادی کر دی۔ شادی کے دوسرے ہی سال ان کے اولاد ہوئی۔ اس سے چند ہی روز بعد خانہ داری کا تمام بار ان کی گردن پر پڑ گیا جس سے آج تک سر اٹھانے کی مہلت نہ ملی۔ نہ انھیں یاروں کے ساتھ راتوں کو پھرنے کا اتفاق ہوا تھا، نہ اونچے کوٹھوں تک ان کی نیچی نظریں اٹھنے پائی تھیں، نہ رقص و سرود کی محفلوں میں انھیں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ غرضکہ یہ اس کوچے سے بالکل ہی نابلد تھے۔

القصہ مادھو سے انھوں نے پورے دو گھنٹے محنت لی اور خود بھی دم نہ لیا۔ اس اثنار میں بلدیو کئی مرتبہ کسی نہ کسی بہانے سے اس کھپریل میں آ آ کے ان کا پڑھانا دیکھ گیا۔ یہ ابھی تھوڑی دیر اور پڑھاتے مگر اب نو بج گئے تھے۔ مادھو کے اسکول جانے کا وقت تھا۔ یہ اپنی جگہ سے اٹھے ہی تھے کہ بلدیو مستری نے انھیں اشارے سے بلایا اور ایک فردِ حساب کی نکال کے پڑھوائی۔ اس میں کاریگروں کے چٹھے کی تفصیل تھی۔ شنکر لوہار اور ماتا دین بڑھئی کے حساب میں کچھ گنجلک تھی۔ اسے صاف کرا لیا۔ ان کا نام بھی مع شرحِ تنخواہ اسی فرد میں لکھوا دیا۔ اب یہ گھر روانہ ہوئے۔

بلدیو کے کارخانے میں اور تو کوئی ایسی بات نہ تھی جو ان کے دل میں کوئی خاص اثر کرتی۔ مگر بھاری ہتھوڑوں کی آوازیں اور بڑی دھونکنیوں کی جھنکاریں

ابھی تک ان کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ لوہے کا سرخ ہو کر بھٹی سے نکلنا۔ نہائی پر رکھا جانا اور اس پر توانا ہاتھوں کی چوٹوں سے شراروں کا اڑنا تخیل کے پردوں پر منقش ہو گیا تھا۔ محنت اور جفاکشی کی مجسم صورتیں آنکھوں میں پھر رہی تھیں۔ ضرورت اور مفلسی اہلِ حرفہ کے ذلیل اور کم رتبہ ہونے کے بیہودہ اعتقاد کو جو دولت آرام طلبی اور تن آسانی کے منحوس اثر سے دلوں میں مدت ہائے دراز سے راسخ ہو گیا ہے اب ان کے دل سے ہٹا رہی تھیں۔ بلدیو مستری کے کارخانے میں کسی کاریگر کا روزینہ چھ آنے روزانہ سے کم نہ تھا۔ انھوں نے اپنے روزینہ کا حساب لگایا۔ صرف ڈھائی آنہ روز سے کچھ کوڑیاں اوپر ہوئیں۔ اس حساب سے بھی سب سے کمتر ٹھہرے۔ یہ خیال دل میں آیا ہی تھا کہ حسب نسب کے توہمات نے آ کے گھیرا اور اس کے ساتھ ہی ایک قسم کا غرور دل میں چکر کھانے ہی کو تھا کہ انھوں نے اسے ایک شیطانی وسوسہ تصور کر کے لاحول پڑھی۔ دادا جان رسالہ دار تھے۔ لیکن خیریت سے وہ رسالہ غدر سے پہلے ہی شکست ہو گیا تھا۔ نانا جان نواب زادے تھے مگر خاندانی پنشن ان ہی کے حین حیات تھی، اب اس کا مثلث کیسا ایک حبہ بھی ہمیں نہیں ملتا۔ دادی اماں کے پاس چالیس لونڈی غلام تھے مگر بیوی اپنے ہاتھ سے چولھا پھونکتی ہیں۔ بڑے ماموں خدا بخشے فیل نشیں تھے مگر میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہوں۔ پانچ روپیہ کی نوکری ایسی چیز ہے کہ اس کے لیے سویرے اٹھ کے محمود نگر سے نہر کے اس پار کوئی تین میل کے فاصلہ پا پیادہ جاتا ہوں اور اب قریب دس بجے کے گھر جاتا ہوں۔

فاقہ میں نہ عالی نسبی کام آئی نہ والا حسبی۔ دو حرف جو پڑھ لیے تھے اس سے بلدیو تک رسائی ہوئی اور پانچ روپے کا سہارا ہو گیا۔ آیندہ بھی

جو کچھ امید ہے اسی سے ہے۔ ان مہمل خیالات سے کچھ کام نہ چلے گا۔ بہتر ہے کہ انھیں یہیں سے رخصت کر دو اور گنگا پار کی طرف کا راستہ بتا دو۔

اسی اثنار میں یہ خیال آیا کہ آخر گھر تو جاتے ہی ہو حضرت گنج کی طرف سے ہو کر نکل چلو۔ آڈٹ آفس میں کل عرضی دی تھی۔ بڑے بابو نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ مگر صاحب کے ملاحظہ کے لیے عرضی رکھ لی تھی۔ شاید صاحب نے کوئی حکم موافق چڑھایا ہو۔ ذہن نے ابھی اس بات کا فیصلہ نہ کیا تھا کہ چلنا چاہیے یا نہیں اور نہ ابھی وہ مقام آیا تھا جہاں سے حضرت گنج کو راستہ مڑتا ہے۔ اب یہ نہر کے پل پر تھے۔ یہاں سے چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ ایک کباڑیے کی دکان پر نظر جا پڑی۔ یہاں بہت سی پرانی کتابیں تلے اوپر رکھی تھیں۔ جی میں آیا ان کتابوں میں دیکھو، شاید کوئی مطلب کی ہو۔ یہ امنگ دل میں اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ رات والی چونی ابھی تک جیب میں پڑی پڑی تھی۔ فوراً ہی افلاس نے اپنی مہیب صورت دکھا کے چشم نمائی کی۔ انھوں نے ادھر سے منہ پھیر لیا۔ آگے بڑھے۔ اب وہ مقام آگیا جہاں سے حضرت گنج کو سڑک جاتی ہے۔ یہاں انھیں چند لمحہ ٹھہرنا پڑا۔ پھر یہ سوچ کے کہ ابھی سویرا ہے آڈیٹر صاحب گیارہ بجے دفتر میں آتے ہیں۔ اس وقت وہاں جا کر کیا کروگے۔ ایسا ہے تو کبھی چلے جانا۔ گھر کی طرف کا راستہ لو۔ اس کے بعد راستہ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس کا بیان ان کے ذہنی تغیرات کو سمجھانے کے لیے ضروری ہو۔ صرف انھوں نے ایک بات دیکھی اور خوب سمجھے کہ صدر بازار سے لے کر امین آباد تک راستہ میں جو لوگ ملے ان کے چہروں سے ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور غور کے آثار پائے جاتے تھے۔ ان کے لباس میں ایک طور کی بے پروائی اور سادگی نمایاں تھی۔ ان کی رفتار میں